اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۷، شمارہ۳، مسلسل شمارہ:۳۶۵، سال۲۰۲۲ء

دیوارِ آب: گم شدہ تہذیبی شعور کی بازگشت

طلحہ فاران
بی اے آنرز (اسکالر)
شعبہ اردو، جی سی یونی ورسٹی، لاہور

DEEWAR-E- AAB : ECHO OF THE LOST CIVILIZATION

Talha Faran
BA Honours (Scholor)
Department of Urdu, GCU, Lahore

Abstract

This study explores the cultural and mythological symbols in Urdu ghazal that were introduced in the early seventies. Besides, it intends to look back to the past and find the significance and the relevance of the current scenario at that time. Muhammad Izhar-ul-Haq is a prominent and prolific poet who has also used mythological and cultural symbols from Arab and non Arab civilizations in Urdu ghazal. His first collection of Ghazals, Deewar-e Aab, is an important milestone in this new style of ghazal. Conclusively, the article is an attempt to cover the different stages of Muhammad Izhar- ul- Haq's civilizational sensibility in Deewar-e Aab.

Keywords:
Civilizational Sensibility, Arab Cultural symbols, Deewar-e-Aab, Muhammad Izhar- ul- haq, Mythological Ghazal, Jadeed Tar Ghazal

اردو غزل کی شگفتہ روایت نے کئی بہاریں دیکھیں، ہر دور میں غزل نے نئے روپ دھارے اور نئے رنگوں سے ہم آہنگ ہوئی۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں جب پاکستان میں جغرافیائی سطح پر بڑی تبدیلی رونما ہوئی تو اس نے ہر حساس دل پر کاری ضرب لگائی۔ ایسی حالت میں موجودہ منظر نامے کے ریگ زاروں سے فرار پانے کے لیے، ماضی کے مرغ زاروں میں کھلے پھولوں کی بو باس کو ترجیح دی گئی۔ اس لیے اردو کے پاکستانی غزل گو شعرا نے مشترکہ طرز احساس کے ساتھ غزل میں اساطیری اور تہذیبی علائم کو متعارف کروایا۔ اس رویے نے نہ صرف تہذیبی و اساطیری عناصر کے سہارے ماضی کی طرف مراجعت میں مدد دی بل کہ اپنے موجودہ منظر نامے کی رمزیت تلاش کرنے کا بھرپور موقع بھی فراہم کیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ اور ۱۹۷۱ء کے سقوط مشرقی پاکستان نے جو گھاؤ شعرا کے فکری وجود پر لگائے تھے، ان کو بھرنے کے لیے بھی ماضی کے جھروکے میں جھانکنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی لیے ۱۹۷۰ء کی دہائی کی غزل میں تہذیبی و دیومالائی عناصر اور علائم وافر نظر آتے ہیں۔ کچھ نقادوں نے اس دور میں لکھی جانے والی غزل کو ''اساطیری غزل'' بھی کہا ہے۔

اس دور میں اساطیری غزل کے پیش رویوں میں علی اکبر عباس (پ:۱۹۴۸ء)، ثروت حسین (۱۹۴۹ء-۱۹۹۶ء)، غلام حسین ساجد (پ: ۱۹۵۲ء)، افضال احمد سید (پ: ۱۹۴۶ء)، خالد اقبال یاسر (پ: ۱۹۵۲ء)، محمد اظہار الحق (پ: ۱۹۴۸ء) وغیرہ شامل ہیں، جب کہ شاعرات میں پروین شاکر (۱۹۵۲ء-۱۹۹۴ء)، شاہدہ حسن (پ: ۱۹۵۲ء) اور فاطمہ حسن (پ: ۱۹۵۳ء) کی شاعری میں بھی کسی حد تک اساطیری اور تہذیبی علائم کی جھلک ملتی ہے۔ ان شعرا نے اس نئی طرز کی غزل کو اعتبار بخشا۔ انھوں نے نہ صرف تہذیبی اور دیومالائی علامتوں کو استعمال کر کے غزل کی فضا کو فکری شگفتگی عطا کی بل کہ عربی و عجمی تہذیب کے گوشوں کی جانب رجوع کرنے کا موقع بھی دیا۔ ستر کی دہائی میں لکھی جانے والی اساطیری غزل میں جو علائم استعمال ہوئے ہیں، ان کے بارے میں غلام حسین ساجد لکھتے ہیں:

> ''موجود کی بے حسی اور جمود کو شاید اسی طرح توڑنا ممکن تھا جس سے راستہ نکالنے کے لیے خواب، چراغ، آئنہ، آسمان، شمشیر، رہوار، جھروکے، محل سرا، خدام و خرگاہ اور ایسی بہت سی تہ دار علامتوں کو استعمال میں لانا ضروری تھا۔''(۱)

یہی وہ علائم ہیں جو عربی و عجمی یا اسلامی و غیر اسلامی تہذیب کے نمائندہ ہو سکتے ہیں۔ نیز بر عظیم میں پروان چڑھنے والی مخلوط تہذیب میں بھی ان علامتوں کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔

اساطیری غزل گویوں میں محمد اظہار الحق ایک اہم شاعر ہیں جن کے یہاں گہرا تہذیبی شعور ملتا ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ **دیوارِ آب** ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا جسے ''آدم جی ایوارڈ'' سے بھی نوازا گیا۔ یہ شعری مجموعہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ اردو کی جدید غزل کی روایت میں 'اساطیری غزل' کی ایک کڑی ہے۔اس مجموعے میں جابہ جا تہذیبی علائم اور داستانوی عناصر کو نشان زد کیا جا سکتا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ اظہار الحق بھی اسی قبیل کے شاعر ہیں جنھوں نے اساطیری و تہذیبی علامتوں کے سہارے ماضی کی طرف مراجعت اور اس وقت کی موجودہ صورت حال میں رمزیت تلاش کرنے کی کوشش کی۔ موجود کی رمزیت کی جست جو کی وجہ سے ان کا رویہ رجائیت پسند ہے۔ان کی مراجعت اس لیے نہیں کہ وہ حقیقت سے منھ موڑ کر ماضی کے مرغ زاروں میں آرام کرنا چاہتے ہیں بل کہ وہ اپنے ماضی سے ایسی توانائی حاصل کرتے ہیں جو ان کو اپنی اصل سے جا ملنے کی طاقت فراہم کرتی ہے۔

بھٹک رہے ہیں مثالوں میں اب جو خاک بہ سر
وہ اس لیے کہ ہمیں اصل سے جدائی ہوئی(۲)

محمد اظہار الحق عربی و عجمی ہر دو تہذیبوں کا درک رکھتے ہیں اور اس کا اظہار اپنے اشعار میں کرتے ہیں۔ان کا تہذیبی شعور، تہذیبی آشوب کا تدارک کرتے ہوئے رجائی رویہ رکھتا ہے اور مستقبل کے لیے مایوس نظر نہیں آتا۔ان کے یہاں عرب اسلامی تہذیب کے عناصر بھی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ **دیوارِ آب** میں وہ محل سرا، کتبے، خدام، خیمے، نعل، شمشیر، چراغ وغیرہ علامتوں کا استعمال کرتے ہیں۔اس کے ساتھ قرطبہ اور الحمرا جیسے اہم گذشتہ اسلامی مراکز کا تذکرہ بھی شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد (۱۹۷۰ء)، محمد اظہار الحق کے عرب تہذیبی شعور کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اظہار کی شاعری میں اسلامی تہذیب و تمدن کے روشن زمانے اپنے تمام تر جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ مسلم تہذیب کی ثروتوں کے اظہار کے لیے انھوں نے فقر و درویشی اور سلطنت و شاہی کے عناصر اور علامتیں استعمال کر کے غزل کے دائرہ لفظیات کو کشادگی عطا کی ہے۔ لفظیات کا یہ چناؤ ان کے تاریخی شعور اور تہذیبی میلان کا گواہ ہے۔''(۳)

محمد اظہار الحق کی غزل میں موجود علائم صرف عرب اسلامی تہذیب کی ہی نہیں عجمی تہذیب کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی غزل میں عربی اور عجمی ہر دو تہذیبی عناصر کے مل جانے سے ایک ایسی فضا تخلیق پاتی ہے جو چند لمحوں کے لیے صدیوں پر محیط تاریخ کے سفر پر لے جاتی ہے۔

جب کوئی تہذیب اجتماعی سطح پر انحطاط کا شکار ہوتی ہے تو فرد کی سطح پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ انحطاط فرد کی زندگی میں آشوب کا سبب بنتا ہے اور زندگی تھکے ماندے پٹھوں کی طرح تناؤ کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسی سطح پر فرد داخلی توڑ پھوڑ کا شکار ہو جاتا ہے اور یک گونہ مایوسی اسے آلیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں فرد کی سطح پر انسان کی زندگی بے بسی کی مثال بن جاتی ہے۔ یہی داخلی آشوب اور بے بسی کسی شاعر کے شعر میں ڈھل جاتی ہے یا کسی نثر نگار کی نثر میں۔ **دیوارِ آب** میں اظہار الحق کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ انھوں نے تہذیبی آشوب کو اپنے داخلی آشوب سے آمیز کر کے شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے جس سے ان کے تہذیبی شعور کی صداقت اور شفافیت (Purity) کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں یہ شعور کسی گروہ کی تقلید میں نہیں بل کہ ان کے ایک اَن دیکھے جہان کی صورت پذیری کی سعی ہے۔

دیوارِ آب میں محمد اظہار الحق کی گم شدہ تہذیب سے دل بستگی اور اس کے حقیقی شعور کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان کے یہاں تہذیبی شعور دو مدارج پر کار فرما نظر آتا ہے۔ پہلی سطح پر وہ تہذیب کی اوج اور شان و شکوہ کو مد نظر رکھتے ہیں اور تہذیبی علائم کے ذریعے تصویر کشی کرتے ہوئے ایک داستانوی فضا قائم کرتے ہیں جب کہ یہ فضا ماضی کی طرف کھلنے والا جھروکا بن جاتی ہے۔ دوسری سطح پر وہ تہذیبی انحطاط کے پیشِ نظر مسائل، اسباب اور اثرات کو لطیف انداز میں پیکرِ شعر میں ڈھالتے ہیں۔ اس

دوران میں ان کے اشعار میں ہلکا سا حزنی رویہ در آتا ہے یعنی وہ نوحہ تو کرتے ہیں لیکن آہ و بکا نہیں کرتے۔اس طرح عربی و عجمی تہذیب کے عروج سے زوال تک کا سفر ان کی **دیوار آب** میں دیکھا جا سکتا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہ گم شدہ تہذیب کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔

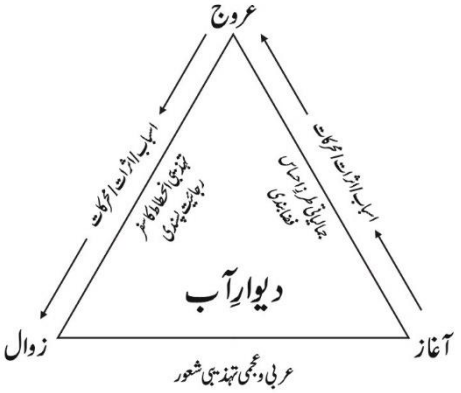

دیوارِ آب میں محمد اظہار الحق کا تہذیبی شعور، پہلے درجے پر قدیم تہذیبی فضابندی میں کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ وہ مختلف علائم کو استعمال کرتے ہوئے تہذیبی فضا تخلیق کرتے ہیں۔ان علائم میں عربی و عجمی ہر دو تہذیبوں کو نشان زد کیا جا سکتا ہے۔**دیوار آب** میں استعمال کیے گئے اہم تہذیبی علائم یہ ہیں: الحمرا، قرطبہ، محل، عود، جھاڑ فانوس، مشک، خیمہ، بارہ دری، گھوڑے، نعل، زین، انجیر، زیتون، یاقوت، زمرد، لعل و گہر، سنگِ مرمر، شاخِ انگور، کنیزیں، شراب، انجیر، پوستین، طلائی فرغل، لوبان، جنگل، کٹیا، قصر، شاہ، چوب دار، غلام، مشعل، کمین گاہ، درانتی، خچر وغیرہ۔ان علامتوں کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علامتیں کسی نہ کسی سطح پر عرب کی اسلامی تہذیب اور عجم کی غیر اسلامی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں۔اس کو شراب اور شاخِ انگور کا ایک حسین امتزاج بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ بہت خوبی سے ایک دوسرے کی ثنوی تخالف تہذیبوں کو ایک ہی غزل میں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ سنگِ مرمر پر زندگی گزارنے، کنیزوں کے غول میں سانس لینے اور شراب کی بہ جائے شاخِ انگور پر گزر کرنے کے علاوہ بھی عرب کی اسلامی تہذیب کے باشندوں کے پاس جواز ہے جو ان کو مٹی کے گھروں اور سادگی کی زندگی کی اور کھینچتا ہے۔ یہی وہ اصل ہے جو کسی انسان کے لیے ہزار آسائشوں، سنگِ مرمر، کنیزوں کے وجود اور

شاخِ انگور کی دست یابی کو بے معنی کر دیتی ہے، اور گزر بسر کے لیے ایک مٹی کا گھر کافی لگنے لگتا ہے۔ عرب اسلامی تہذیب میں اس تصورِ حیات کو بہت تقویت حاصل رہی۔ دوسری طرف عجم کی تہذیب ہے جن کے یہاں دنیاوی شان و شوکت حتمی ہے اور وہ آئندہ کی دائمی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے، اس لیے ان کو شراب، پوستینیں، انجیر اور طلائی فرغل مرغوب ہیں۔ کاشغر کے انجیر مشہور ہیں اور مادہ پرست شاہوں کو شراب مرغوب ہے اور طلائی فرغل زیبا۔ یہی چیزیں عجم (کاشغر) کے لوگوں کی تہذیبی روایت کا حصہ ہیں۔ اظہار الحق اپنے تہذیبی شعور کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے، عرب و عجم کی تہذیبوں کے نمائندہ تصورِ حیات کو شعری قالب میں ڈھالتے ہیں:

یہ سنگِ مرمر، یہ شاخِ انگور، یہ کنیزیں
مگر کوئی کھینچتا ہے مٹی کے گھر کی جانب
شراب، انجیر، پوستینیں، طلائی فرغل
چلا پہاڑوں میں قافلہ کاشغر کی جانب(۴)

دیوارِ آب میں جہاں عربی و عجمی تہذیبوں کے نمائندہ عناصر کو نشان زد کیا جا سکتا ہے، وہیں خالصتاً عرب کی تہذیبی فضا بھی دکھائی دیتی ہے۔ محمد اظہار الحق عود، جھاڑ فانوس، انجیر، زیتون، وادی، یاقوت، زمرد وغیرہ جیسی علامتوں کا استعمال کرتے ہیں جس سے عربوں کے تمدن و تہذیب کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ وہ ان علائم کا استعمال کرتے ہوئے، عرب تہذیب کے اوج کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ان کے نزدیک عود کا سلگنا اور محل میں جھاڑ فانوس کا ہونا، تہذیبی و سیاسی تونگری کی علامت ہے جس کے نتیجے میں انسان کے لہو میں مشک کی بو باس سما جاتی ہے اور اعضا سے شعائیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقوام کی تہذیبی اوج سیاسی استحکام کی مرہونِ منت ہے۔ سیاسی استحکام ہی عوام سے خواص تک کے لہو میں مشک کی خوش بو اور بدن سے صداقت کی شعاؤں کے پھوٹنے کا ضامن ہے۔ محمد اظہار الحق لکھتے ہیں:

محل ہے سلگتا عود ہے اور جھاڑ فانوس
لہو سے مشک اور اعضا سے شعائیں پھوٹتی ہیں(۵)

یہی نہیں وہ مزید عرب تہذیب کا نقشہ کھینچتے ہیں، جس میں انجیر، زیتوں کی پکار سنائی دیتی ہے۔ لیکن اس وادی میں زمانی بُعد کے سبب جانا ممکن نہیں۔ جہاں کی تہذیبی شان و شکوہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں کے باغات میں درختوں کے تنے یاقوت کے، شاخیں زمرد کی اور ان پر لگنے والے پھل لعل و گہر ہیں۔ نہ صرف یہ، ان درختوں کا سایہ بھی نہیں ہے۔ دھوپ کی طرح درخت کا سایہ بھی ایک ارزاں شے ہے۔ لیکن یہاں پر جو شوکت اس تہذیب کی علامتوں میں بتائی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس قدر پر شکوہ تہذیب کے تقدس کے پیشِ نظر اس نخل کا سایہ بھی نہیں، جو ارزاں شے ہے۔ بہ قول محمد اظہار الحق:

بلاتے تھے ہمیں انجیر اور زیتون کے پھل
مگر وادی میں جانے کا کوئی رستہ نہیں تھا
تنا یاقوت کا شاخیں زمرد کی بنی تھیں
ثمر لعل و گہر تھے نخل کا سایہ نہیں تھا(۶)

کوئی تہذیب یک لخت ارتقا کی منازل طے کرتی ہے نہ اس کا انحطاط فوراً ہوتا ہے۔ لیکن آسمان کی بلندیاں چھوتی تہذیبیں جلد زوال آمادہ ہو جاتی ہیں۔ محمد اظہار الحق تہذیبی فضابندی کے ساتھ اس بات کا بھی مکمل درک رکھتے ہیں کہ تہذیبیں جو اوجِ ثریا تک پہنچیں خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی، ان کی ترقی کے اسباب کیا تھے۔ جرمن فلسفی نطشے (۱۸۴۴۔۱۹۰۰ء) نے کہا تھا کہ ''خطرے میں جیو'' یعنی ہر وہ شخص جو اپنے سامنے آنے والے خطرات سے آشنا رہتا ہے اور پھر ایک چاق چوبند زندگی گزارتا ہے وہ کامران ہوتا ہے۔ تہذیبوں کا معاملہ بھی فرد ہی کے جیسا ہے۔ جب تک وہ آنے والے خطرات سے آنکھیں نہیں پھیرتیں، ان پر زوال نہیں آتا۔ **دیوارِ آب** میں اظہار الحق کے یہاں اس کا بھی شعور ملتا ہے کہ ترقی یافتہ تہذیبیں یوں ہی نہیں بن جاتیں، بل کہ ان کے پیچھے عسکری اور فکری قوتیں موجود ہوتی ہیں۔ عربوں کے یہاں عسکری قوتوں کے ہونے کی بنا پر سندھ تک تسخیر کر لیا گیا اور قیصر و کسریٰ زیر نگیں کر لیے گئے۔

ایسا کون ساو تیرہ تھا جس نے عربوں کو عالم پر راج کرنے کے مواقع بہم پہنچائے، وہ یقیناًان کی مسلسل مساعی تھی۔ محمد اظہار الحق کہتے ہیں:

بہشت سے بھی سنا ہے بڑھ کر حسین ہو گی
تمھاری منزل بہارو! اب زمین ہو گی
ستارہ گھوڑے کی آنکھ اور چاند نعل ہو گا
سفر میں چاندی کی دھول سونے کی زین ہو گی(۷)

دیوارِ آب کے تناظر میں محمد اظہار الحق کے تہذیبی شعور کی گہرائی اور صداقت کا علم ہوتا ہے کہ وہ اپنے داخلی و خارجی آشوب کو تہذیبی علائم میں آمیز کر کے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی قلبی وارداتوں کو تہذیب کی نمائندہ علامتوں کا سہارا دے کر شعر کے پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ ان کے یہاں یاد صرف یاد نہیں رہتی، بل کہ یاد ایک خیمہ بن جاتی ہے، دھیان ایک جنگل بن جاتا ہے۔ پلکیں آنکھ کی روشیں بن جاتی ہیں اور آنسو صبح تک ان پر گل گشت کرتے دکھائی دیتے ہیں جب کہ ان کا دھیان اور یادوں کی پٹاری گل زار بن کر مہکنے لگتے ہیں۔ نیز ان کی شعریات میں آنکھیں برج بن کر سامنے آتی ہیں جن میں شمعیں جھنکارتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جمالیاتی سطح پر بھی قدیم عربی و عجمی تہذیب کی علامتیں ایک شگوفہ بن کر **دیوارِ آب** میں کھلتی ہیں۔ جو تہذیبی فضا محمد اظہار الحق تخلیق کرتے ہیں وہ ان کی حس جمالیات کی عکاس دکھائی دیتی ہے۔ وہ زندگی کے عام زوایوں کو تہذیب کے عناصر کے مماثل قرار دیتے ہیں جس سے کلام میں شگفتگی کے ساتھ تہذیبی شعور کی پختگی بھی نمایاں ہوتی ہے۔

ایک ایک خیمہ یاد کا اکھڑ چلے
دھیان بن میں کاش تیز آندھیاں چلیں(۸)
روشِ چشم پہ رہتی ہے سحر تک گل گشت
رات پڑتے ہی مہک اٹھتا ہے گل زار مرا(۹)
آنکھوں کے برجوں میں شمعیں، دل میں لہو کی جھنکاریں
پھر بھی دعا کی شہر پنہ کا باب اثر معلوم نہیں(۱۰)

جب مسلم عربوں نے قریبی ریاستوں کو اپنے تدبر سے استحکام بخش دیا تو انھوں نے دور دراز کے علاقوں میں بھی مہم جوئی کی تاکہ دوسرے علاقے بھی مسلم عرب حکم کے زیر نگیں کیے جائیں اور عربوں کی تہذیبی سطوت کو وقار بخشا جائے۔اسی سلسلے کی ایک کڑی اندلس کی فتح بھی ہے۔اندلس کی فتح مسلمان عربوں کی آخری بڑی فتح تھی۔عرب آبیریائی جزیرہ نما سے یورپ میں داخل ہوئے اور ایک ایسی حکومت قائم کی جس نے مشرق کا دروازہ مغرب میں کھول دیا۔اس کا دارالحکومت دمشق تھا۔اندلس میں عربوں کی قائم کردہ حکومت نے علمی و عملی ترقی کی۔ فن تعمیر میں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی عمارتیں بنا کر اپنا لوہا منوایا۔وہ عمارتیں آج تک موجود ہیں اور عرب تہذیب کی علامت ہیں۔**دیوار آب** میں اندلس کی عرب تہذیب کے دو شاہ کاروں (قرطبہ و الحمرا) کا ذکر ہے۔اندلس پر عربوں نے طویل حکومت کی اور اپنی تہذیبی چھاپ بھی چھوڑی۔آج بھی اسپین کے تمدن پر عرب تہذیب کی چھاپ ہے۔عربوں کی اندلس میں تعمیرات میں سے ایک اہم عمارت الحمرا ہے جس کو ''محمد الاحمر (۱۱۹۵۔۱۲۷۳ء) نے تقریباً ۱۲۴۸ء میں اپنے قصر کی تعمیر کے لیے چنا اور اس کی تعمیر کا آغاز کیا۔ابوالحجاج یوسف (۱۳۳۳۔۱۳۵۴ء) اور اس کے جانشین محمد پنجم الغنی (۹۔۱۳۵۴ء) نے اس کی تکمیل کی۔''(۱۱) اس میں اینٹ، گچ، لکڑی اور پانی کا استعمال ہوا تھا اور اس قصر کا کل رقبہ ۲۲۰۰ میٹر تھا۔''اس قصر کے ہر حصے پر بنو احمر کی علامت لا غالب الا اللہ کندہ ہے۔''(۱۲) الحمرا کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔لیکن آرائشی لحاظ سے الحمرا کا خوب صورت حصہ ''فناء السباع'' ہے جس میں حوض ہے، اور اس کے چاروں جانب شیر بنے ہیں، جن کے منھ سے پانی کی دھاریں نکلتی ہیں۔ اس حوض کے 'چشموں کے پانی میں گنبدِ گردوں ایک حباب' تھا۔ محمد اظہار الحق کے یہاں الحمرا کی علامت مسلم عرب تہذیب کے اوج کی نمائندگی کرتی ہے۔الحمرا زوال آمادہ مسلم عرب تہذیب کا آخری نمائندہ قصر تھا جس کے ساتھ ہی مسلم عرب تہذیب انحطاط کا شکار ہونا شروع ہو گئی۔اظہار الحق کے یہاں الحمرا کا ذکر سنتے ہوئے حزن کا احساس نہیں ہوتا بل کہ ایک تفاخر کا رویہ سامنے آتا ہے۔وہ 'صدیوں پر پھیلی رات کے سچے خواب میں الحمرا' کو دیکھتے ہیں۔ان کے نزدیک زوال آمادہ تہذیب کی آخری عظیم نشانی الحمرا ہے۔اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ والہانہ انداز میں یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ 'سرخ لہو میں الحمرا ہے، سرخ گلاب میں الحمرا'۔ الحمرا

عربوں کی تہذیب کا گہوارہ تھا جہاں سے یورپ میں مار کرنے کے لیے راستے بنائے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ الحمرا اور اہل الحمرا کے ہاتھ سمندر کی نبضوں پر اور پاؤں رکاب میں رہے۔ ہر چند کہ ان کی مساعی کے باوجود اندلس میں تہذیب انحطاط کا شکار ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن اہلِ الحمرا کی مساعی نے مسلم عرب تہذیب کو جو وقار بخشا وہ رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ **دیوارِ آب** میں وہ الحمرا کو تہذیبی جمالیات سے مزین کر کے پیش کرتے ہیں:

اس کے چشموں کے پانی میں گنبدِ گردوں ایک حباب
دن اور رات کی سطح سے اوپر ایک سحاب میں الحمرا
سب زیتون کے باغ اس سے، سارے شہر میں چراغ اس سے
ہاتھ سمندر کی نبضوں پر پاؤں رکاب میں الحمرا
رستے زخم کی دو تصویریں، اک میں دمک ہے اک میں کسک
سرخ لہو میں الحمرا ہے، سرخ گلاب میں الحمرا
جس دن فلک سے ستارہ ٹوٹا سامنے آئے گی تعبیر
صدیوں پر پھیلی ہوئی رات کے سچے خواب میں الحمرا(۱۳)

الحمرا کے عالی مرتبت ہونے کے بیان میں محمد اظہار الحق مزید کہتے ہیں:

زر اور مرمر حرف ہیں میرے، وقت کی نوک قلم میرا
میں الہام ہوں میرے سب سے روشن باب میں الحمرا(۱۴)

دیوارِ آب کے تناظر میں محمد اظہار الحق کے تہذیبی شعور کا یہ پہلا درجہ ہے جس میں وہ مختلف علامتوں کا استعمال کرتے ہوئے تہذیبی فضا قائم کرتے ہیں۔ وہ عرب و عجم کی تہذیب کی اوج کو شعری قالب میں ڈھالتے ہیں۔ پھر تہذیبی علائم میں اپنے داخلی جذبات کی آمیزش کرتے ہیں جو اس بات کا عندیہ ہے کہ وہ عرب و عجم کی مخلوط تہذیب کے باسی ہیں اور بہ یک وقت اس پر فاخر بھی ہیں اور آئندہ اس کے انحطاط پر محزون بھی ہوں گے۔

محمد اظہار الحق کے تہذیبی شعور کا دوسرا درجہ تہذیبی انحطاط سے بہرہ ور دکھائی دیتا ہے اور وہ تہذیبی انحطاط سے پیدا ہونے والے مسائل، ان کے اسباب اور اثرات کو نشان زد کرتے ہیں۔ یہ تہذیبی انحطاط عربی و عجمی ہر دو سطح پر موجود ہے۔ وہ عربوں کی تہذیب کے انحطاط کے اسباب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پھر عجمی تہذیب کی نمائندی ہند و مسلم تہذیب کے انحطاط کا نوحہ کہتے ہیں۔ ان کے یہاں اس دوران میں حزنی رویہ دکھائی دیتا ہے جو اس بات کی بھی دلیل ہے کہ ان کی بر عظیم کی تہذیب سے وابستگی ہی نہیں دل بستگی بھی ہے۔ وہ سلاطین کی آنکھوں میں پھرتی سلائیوں کا نوحہ کہتے ہیں تو کبھی طشت میں سجائے گئے سروں پر گریہ کرتے ہیں۔ تہذیبوں کی ترقی کے زمانے میں عوام و خواص میں جواہرات بانٹنے والے کس طرح بے کسوں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ قرطبہ مسلم عرب تہذیب کا گہوارہ تھا، جس کو قبل مسیح میں رومیوں نے فتح کیا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے اندلس پر فوج کشی کی تو اسے خلیفہ دمشق کے تحت ایک صوبائی دارالحکومت بنا دیا گیا۔ بعد ازاں ۷۶۶ء میں اس کو خود مختار مسلم امارات اندلس کے دارالحکومت کے طور پر منتخب کیا گیا جس کے بعد ارباب اختیار کی شبانہ روز محنت سے قرطبہ مسلمانوں کی عرب تہذیب کا ثقافتی، مالی، سیاسی اور اقتصادی مرکز بنا۔ قرطبہ شہر میں اسلامی تہذیب کا گہوارہ مسجد قرطبہ تھی۔ ''اس کی بنیاد عبدالرحمن اول (۷۳۱۔۷۸۸ء) نے ۷۸۶ء میں رکھی تھی جسے اس کے بیٹے ہشام اول (۷۵۶۔۷۹۶ء) نے ۷۹۳ء میں مکمل کیا۔''(۱۵) یہ مسجد مسلمانوں کی شان و شوکت کی امین تھی اور امارات اندلسی کے سطوتِ شاہی کی ضامن۔ محمد اظہار الحق نے قرطبہ کے اس تاراج کو بہتر زخموں سے تشبیہ دی ہے۔ یہی نہیں وہ قرطبہ کو دریدہ شال اوڑھنے والی حسینہ کہتے ہیں جو اپنے حال کا خود نوحہ کہہ رہی ہے اور سر میں خاک ڈالے ہوئے ہے۔ وہ ایسی دل گداز منظر کشی کرتے ہیں کہ جس سے حزن کی لو نکلتی دکھائی دیتی ہے۔

کنووں میں زہر تھا گھوڑے سواروں سے الگ تھے
دریدہ شال اوڑھے خاک بر سر قرطبہ تھا
گڑا تھا جس میں لوہا خود کا اس کی جبیں تھی
بہتر زخم تھے جس کے بدن پر، قرطبہ تھا(۱۶)

محمد اظہار الحق قرطبہ کی بربادی کا نقشہ کھینچتے ہوئے قرطبہ جسے عروس البلاد کہا جاتا ہے، اس کا جوبن نکھارنے والے نقاشوں اور ہنر مندوں کا نوحہ بھی کہتے ہیں۔ جن لوگوں کی شبانہ روز محنت نے قرطبہ کو شہروں کی دلہن کا درجہ بخشا، ان لوگوں کو کس طرح مٹتی ہوئی تہذیب کا سیلاب بہالے گیا۔ ان کے سر عرب مسلم تہذیب کے ہاتھوں کے طوطوں کی طرح اڑ گئے۔ قرطبہ تہذیبی تاراج اور انحطاط کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ لہولہو قرطبہ، جس کے پس و پیش میں لہو ہے، محمد اظہار الحق کے شعری قالب میں کچھ اس طرح ظاہر ہوتا ہے:

پسِ دیوار نقاشوں ہنر مندوں کے سر تھے
پھر اک در تھا لہو کا اور پسِ در قرطبہ تھا(۱۷)

دیوارِ آب میں تہذیبی شکست و ریخت میں محمد اظہار الحق کا گہرا تہذیبی شعور شامل ہے۔ وہ شائستہ سے تہذیب کے زوال آمادہ ہونے کا غم کھاتے ہیں اور زوال کے اسباب کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔ ان کا تہذیبی شعور آنکھ بند ھا نہیں جو کسی صورت بھی جواز کی تلاش نہیں کرتا بل کہ وہ ہر حالت میں عروض کی وجوہ اور زوال کے اسباب سے بہرہ ور رہتے ہیں۔

دیوارِ آب میں محمد اظہار الحق تہذیبی علائم کو بروئے کار لاتے ہوئے تہذیبی اور ملکی تاراج کی منظر کشی کرتے ہیں۔ ان کی تخلیق کردہ فضا تہذیب کو شعر کے کینوس پر منعکس کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی لفظوں کے رنگوں سے بنائی تصویریں جان بر ہو کر چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے **دیوارِ آب** میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ غلام مشعلیں لے کر بھاگ رہے ہیں، جنھیں محل پر قیامت ٹوٹنے کا خوف ہے یا تباہی کا اس قدر لمبا سلسلہ ہے کہ مسلسل قناتیں اکھڑی ہوئی ہیں اور لوگوں کا خون دریا کی مانند بہہ رہا ہے۔ وہ تہذیبی علامتوں کے سہارے تہذیبی اور ملکی تاراج کی منظر کشی کرتے ہیں۔ جیسے:

غلام بھاگتے پھرتے ہیں مشعلیں لے کر
محل پہ ٹوٹنے والا ہے آسماں جیسے(۱۸)
ساتھ ساتھ اکھڑی قناتوں کے یوں ہی چلتا جا
اک ذرا آگے رواں خون کا دریا ہوگا(۱۹)

اپنی غفلت کو دو گے کیا انعام
کاٹ کر لا رہی ہے سر میرا(۲۰)

دیوارِ آب کے تناظر میں محمد اظہار الحق کا تہذیبی شعور، جب تہذیبی انحطاط کو نشان زد کرتا ہے تو وہ صرف عرب کی تہذیب تک محدود نہیں رہتا بل کہ عجمی تہذیب کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے۔ ہندی مسلم تہذیب جس کا گہوارہ ہندوستان تھا اور اس بر عظیم پر آٹھ سو سال تک حکومت کرنے والے مغل اپنی غفلت کی بنا پر انگریزوں کے ہاتھوں شکست خوردہ ٹھہرے۔ وہ جس قسم کی علامتیں اور شعری رویے قاری کے سامنے رکھتے ہیں، ان کی کڑیاں مغلیہ خاندان کے تہذیبی و ثقافتی رکھ رکھاؤ سے جا ملتی ہیں۔ بر عظیم کی تہذیبی ساخت میں مغلوں کا اہم کردار رہا ہے۔ ان کی تعمیرات، علمی و ادبی مراکز اور سیاسی و ثقافتی سرگرمیوں نے بر عظیم کی تہذیب پر بہت گہرے اثرات مرتسم کیے۔ لیکن وقت کے ساتھ مغلیہ مرکز کی گرفت دوسرے علاقوں پر کم ہوتی گئی اور ان کا وقار آہستہ آہستہ زوال آمادہ ہو گیا۔ مغلوں میں اقتدار کی ہوس جنم لینے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل شاہ زادے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ احمد شاہ(۱۷۲۵۔۱۷۷۵ء) اور شاہ عالم ثانی(۱۷۲۸۔۱۸۰۶ء) کو اندھا کر دیا گیا۔ میر نے انھی کے بارے میں کہا تھا: شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی /انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں محمد اظہار الحق بھی بر عظیم کی تہذیب کے اس المیے کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں پر ان کی علامتیں اس قدر واضح تو نہیں رہتیں لیکن کہیں نہ کہیں ان علامتوں میں سے بر عظیم کی مغل حکومت کی زوال آمادگی کے اس سبب کی بو ضرور آتی ہے۔

اس کی آنکھوں سے نکالے گا جو سوئیاں اظہار
وہ صلہ پائے گا کچھ ایسا کہ اندھا ہوگا(۲۱)

یہی بے راہ رویاں بر عظیم کی مغلیہ تہذیب کے زوال پذیر ہونے اور انگریزوں کے بر سرِ اقتدار آنے کا سبب بنیں۔ ۱۸۵۷ء کا غدر پرانی تہذیب اور موجودہ تہذیب کے درمیان ایک حد فاصل ہے۔ رفتہ رفتہ انحطاط پذیر مغلوں کی تہذیب ۱۸۵۷ء میں آکر یک سر مٹ گئی۔ اس تہذیب کے

صرف چند نوحہ خواں زندہ بچے۔ مغلوں کا دار الحکومت دہلی تھا۔ عوام کو دہلی سے والہانہ محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہی چھن جانے کے بعد بھی عوام بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵۔۱۸۶۲ء) سے ٹوٹ کر محبت کرتے رہے اور ان کے دہلی میں ہونے تک سب تہذیبی رسم و رواج بہ دستور قائم و دائم رہے۔ لیکن جب غدر ہوا تو سب کچھ لٹ گیا۔ ساری دلی مسمار کر دی گئی، مسلم اکابرین کو چوکوں میں پھانسیوں پر چڑھا دیا گیا۔ یہاں تک کہ بہادر شاہ ظفر پر بھی مقدمہ چلایا گیا۔اس مقدمے کی وجہ ان کے وزیر و مشیر تھے جنھوں نے معمولی لالچ کی بنا پر ایک عظیم سلطنت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ بہادر شاہ ظفر کے بچوں کے سر تھال میں سجا کر ان کے حضور پیش کیے اور ان کو قید کی سزا سنا کر رنگون بھیج دیا گیا۔ شاہد احمد دہلوی (۱۹۰۶۔۱۹۶۷ء) نے اپنے مضمون " دلی کا آخری تاج دار" میں لکھا ہے:

> "شہزادوں کے سر کاٹ لیے گئے اور ان کی لاشیں خونیں دروازے پر لٹکا دی گئیں۔
> بادشاہ کو لال قلعے میں بند کر دیا گیا۔ جب بادشاہ نے دبی زبان سے شکوہ کیا کہ:
> "مجھ سے میری پنشن بحال رکھنے اور نذر کھولنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔"
> تو ہڈسن نے کہا، " ہم تمھاری نذر بھی کھولے گا"۔ یہ کہہ کر شہزادوں کے کٹے ہوئے
> سر ایک طشت میں رکھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیے۔"(۲۲)

محمد اظہار الحق نے بھی برعظیم کی مغلیہ تہذیب کے اس سانحے کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ **دیوارِ آب** میں کار فرما تہذیبی شعور تہذیبی فضا بندی سے شروع ہو کر تہذیبی انحطاط تک آتا ہے۔ جب کسی تہذیب کے باشندے اپنا وقار کھو دیتے ہیں تو نفسا نفسی کی کیفیت چھا جاتی ہے۔ لوگ باغیوں سے ہاتھ ملا کر مال دار ہو جاتے ہیں جب کہ بادشاہ کوڑیوں کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ، بل کہ ہر قسم کے مصائب بادشاہوں پر ڈھائے جاتے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے باغیوں کے آسودہ حال ہونے اور مغلیہ خاندان کے آخری تاج دار پر گزری قیامت کو یوں شعری شکل دی ہے۔

یہ بستی باغیوں کے راستے میں پڑ رہی تھی
یہاں مالک سبھی قلاش اور بندے غنی ہیں

سنہری طشت میں سر اور سر پر تاجِ زریں
منقش چھت ہے دیواروں پہ تعزیریں بنی ہیں(۲۳)

محمد اظہار الحق کے یہاں غدر بھی ایک علامت کے طور پر مستعمل دکھائی دیتا ہے۔ وہ غدر ایسے بڑے تہذیبی المیے کو مستعار لے کر اپنے داخلی تاراج کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ دل کے اجڑ جانے کو بھی غدر سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے:

غدر غدر اجڑیں ہم، خزاں خزاں سوکھیں ہم
لحد لحد اتریں ہم، کریں نہ شور و شیون(۲۴)

غدر کے بعد ساری دلی اجڑ گئی۔ مغلوں کے خون سے ہولی کھیل لی گئی تو کچھ مغل زادوں کی تقصیر معاف ہوئی اور کچھ نہ کچھ پنشن بھی ملنے لگی۔ لیکن جن کے حالات بگڑے تھے وہ بگڑے ہی رہے کبھی ٹھیک نہ ہو سکے۔ بعض مغل زادیاں کچے محلوں میں بنی کوٹھریوں میں رہنے لگیں اور کچھ مغل زادے بھیک مانگنے لگے۔ لیکن وہ بھی شرم کے مارے شام گئے مانگا کرتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۳۔۱۹۵۵ء) نے ایسے ہی ایک مغل زادے نواسہ شاہ ظفر، میرزا قمر سلطان کا قصہ **بیگمات کے آنسو** میں لکھا ہے کہ وہ دلی اجڑنے سے پہلے خوب رو جوانوں میں شمار ہوا کرتے تھے۔ جب بازار سے اپنے گھوڑے پر گزرتے تھے تو لوگ رک رک کے دیکھتے تھے۔ وقت بدلا، دلی اجڑی اور سب ملیامیٹ ہو گیا۔ یہاں تک کہ میرزا قمر سلطان کو سلطنت اور تہذیب کی بربادی نے بھکاری بنا دیا۔ وہ فالج زدہ پاؤں گھسیٹتے ہوئے شام میں کاسہ ہاتھ میں لیے محلہ کلو خواص سے نکلتے اور بھیک مانگتے۔ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

> "اس کی آواز بہت بلند اور بہت دردناک ہے۔ جب وہ نہایت مایوس اور حسرت آمیز لہجے سے کہتا ہے: "یا اللہ ایک پیسہ کا آٹا دلوادے، تو ہی دے گا، تو ہی دلوائے گا۔ ایک پیسہ کا آٹا دلوادے" تو بازار والے اور بازار کے قریب جتنے گھر ہیں ان کے رہنے والے اس کی آواز سے خود بہ خود متاثر ہو جاتے ہیں۔"(۲۵)

اس تہذیبی آشوب کے پس منظر میں دیکھیں تو محمد اظہار الحق کا یہ شعر اس واقعہ پر بہت صادق آتا ہے:

سب اپنے خوابوں میں مست، جب آئے گا گلی میں
فقیر جس کی صدا عجب دل نشین ہو گی(۲۶)

دیوارِ آب میں **محمد اظہار الحق** کا تہذیبی شعور بھلے ہی دو مدارج طے کرتا ہوا، شان و شوکتِ سلطنت سے تاراجِ تخت و تاج کا نقشہ برابر کھینچتا ہے، لیکن کسی جگہ بھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتا بل کہ اس میں ایک رجائی کیفیت روح کی طرح متحرک رہتی ہے۔ یہ مدارج طے کرتا ان کا شعور گم شدہ عربی و عجمی تہذیب کی بازگشت بن جاتا ہے۔ وہ عرب و عجم کی تہذیبوں کی سطوت سے سقوط تک کا سفر فلم کی طرح دکھاتے ہیں جس سے ماضی کی طرف مراجعت اوراس سے مثبت توانائی حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے جب کہ دوسری طرف تہذیب کے انحطاط کے اسباب و اثرات میں موجود کی رمزیت تلاش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہی رمزیت ان کے اشعار میں رجائیت پسندی کا عنصر پیدا کرتی ہے:

اے ارضِ سیہ روز! کوئی اور ہی سورج
شاید کہ بدل جائیں یہ ایام ہمارے(۲۷)

محمد اظہار الحق کی **دیوارِ آب** کے تناظر میں گم شدہ تہذیبی شعور ان کے یہاں ایک گلاب کی طرح کھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو پہلی سطح پر تو مخمل دو خوابا کی طرح ملائم نظر آتا ہے مگر اس کے گرد آشوب وانحطاط کے کانٹے اس قدر خون خوار ہیں کہ انسان کا دل ہر گز ان سے چھلنی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کا تہذیبی شعور جس قدر خوبی سے تہذیبی فضا بندی میں کار فرما دکھائی دیتا ہے اتنا ہی تہذیبی انحطاط کی نشان دہی میں چُست بھی ہے۔ وہ انحطاط کے اسباب و اثرات کو شعری قالب میں ڈھالتے تو ہیں لیکن ان کا مجموعی رویہ رجائیت پسند ہوتا ہے جس سے حالات کے بدلنے کی امید سی بندھ جاتی ہے۔ وہ مردہ تہذیب کا نوحہ تو کہتے ہیں، لیکن ان نیک تمناؤں کے ساتھ:

طواف اس خاک کا کریں غول جگنوؤں کے
کھلیں ہمیشہ گلاب کے پھول سر کی جانب(۲۸)

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) غلام حسین ساجد، ''نقش کوئی کمال کا''، انگارے۔(اگست ۲۰۰۳ء)، ۲۳۔

(۲) محمد اظہار الحق، دیوارِ آب، (اسلام آباد: ابلاغ، ۱۹۸۲ء)، ۹۴۔

(۳) ارشد محمود ناشاد، ''جدید تر اردو غزل کا فنی مطالعہ''، ۱۰ر جولائی، ۲۰۲۲ء
https://chunida.com/tanqeed-shairi/jadeed-tar-urdu-ghazal

(۴) محمد اظہار الحق، کئی موسم گزر گئے مجھ پر، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ۴۸۔

(۵) ایضاً، ۳۸۔ (۶) ایضاً، ۴۷۔

(۷) ایضاً، ۴۶۔ (۸) ایضاً، ۷۵۔

(۹) ایضاً، ۸۸۔ (۱۰) ایضاً، ۹۰۔

(۱۱) محمد اسحاق، اندلس اور سسلی کی مسلم تہذیب و ثقافت، (نئی دہلی: البلاغ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ۹۹۔

(۱۲) ایضاً، ۱۰۰۔

(۱۳) محمد اظہار الحق، کئی موسم گزر گئے مجھ پر، ۴۵۔

(۱۴) ایضاً، ۴۵۔

(۱۵) محمد اسحاق، اندلس اور سسلی کی مسلم تہذیب و ثقافت، ۹۷۔

(۱۶) محمد اظہار الحق، کئی موسم گزر گئے مجھ پر، ۴۳۔

(۱۷) ایضاً، ۴۳۔ (۱۸) ایضاً، ۹۱۔

(۱۹) ایضاً، ۹۶۔ (۲۰) ایضا، ۸۳۔

(۲۱) ایضاً، ۹۶۔

(۲۲) شاہد احمد دہلوی، شاہد احمد دہلوی کے شاہکار خاکے، مرتبہ: حکیم اعجاز حسین چانڈیو، (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۷)، ۲۲۰۔

(۲۳) محمد اظہار الحق، کئی موسم گزر گئے مجھ پر، ۳۶۔

(۲۴) ایضاً، ۹۵۔

(۲۵) خواجہ حسن نظامی، بیگمات کے آنسو، (لاہور: سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۱۵ء)، ۱۰۔

(۲۶) محمد اظہار الحق، کئی موسم گزر گئے مجھ پر، ۴۶۔

(۲۷) ایضاً، ۳۷۔۱ (۲۸) ایضاً، ۴۹۔

BIBLIOGRAPHY

- Arshad Mehmood Nashad, "Jadīd Ter Urdū Ghazel kā Fannī Mutālā". July 16, 2020. https://chunida.com/tanqeed-shairi/jadeed-tar-urdu-ghazal , Accessed July 10, 2022
- Ghulam Hussain Sajid, "Naqsh Ko'ī Kamāl Kā ", *Angārē*, (August 2003).
- Hasan Nizami, Khawja, *Bēgmāt Kē Ansū*, (Lahore: Seventh Sky Publications, 2015)
- Izhar ul Haq, Muhammad, *Dīvār-e Āb*, (Islamabad: Iblag, 1982).
- Izhar- ul- Haq, Muhammad, *Kaī Mausam Guzar Gaye Mujh Par*, (Islamabad: Dost Publications, 2012)
- Muhammad Ishaq, *And'lus aur Sislī kī Muslim Tehzīb-o-Ṣeqāfat*, (New Delhi: Al-Iblāg Publications, 2009).

❖❖❖